

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

کل کاروشن مستقبل اور آج کے سلگتے مسائل

خرم مراد

اس بات میں کسی شک کی جنبائش نہیں کہ ”آج“ کا دامن اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک یقینی روشن مستقبل کے بھرپور امکانات سے لبریز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل جو حوادث و واقعات پیش آرہے ہیں وہ مایوسی پیدا کرتے ہیں، ناکامی و مظلوبیت اور پس ماندگی کی خبر دیتے لگتے ہیں۔ اپنا افتراق و انتشار اور نزاع و اختلاف اور اس کے تباہ کن نتائج دیکھ کر دل بیٹھنے لگتے ہیں۔ اغیار کی سیاسی، فوجی اور ابلاغی قوت و بلا دستی اور ان کے مکر و فن کی کامیابی دیکھ کر حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ہمارے اس یقین میں کوئی کمی نہیں آتی کہ کل سورج طلوع ہو گا تو عزت و سر بلندی اور ترقی کی خوش خبری لے کر آئے گا۔

آج اور کل کے واقعات سے نگاہ اوپر اٹھا کر آج کی اور ۱۹۳ کی دنیا پر ایک نظر ڈالیے، تو آپ کو صحیح اندازہ ہو گا کہ اس نصف صدی میں ہم نے اپنی منزل کی طرف کتنی نمایاں پیش رفت کر لی ہے۔ اسلام ایک مذہب کے مقام سے سفر کر کے مقصد حیات بن گیا ہے۔ وہ مستقبل کی اجتماعیت، ریاست اور تہذیب کے نقشہ گر کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ نسلوں کی نسلوں نے اپنی سعی و جہد اور اپنی آرزو و جستجو کو اس مقصد کے حصول اور اس نقشہ فردا پر مرکوز کر دیا ہے۔ ملت کے جسم میں احیاء اسلام کے ساتھ وابستگی کی ایک رو دوڑ گئی ہے اور حوصلہ شکن حالات اور ناکامیوں کے باوجود یہ وابستگی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اہلیس نے جس کو فتنہ فردا قرار دیا تھا وہ اس کے عالم پیر کے لیے فتنہ امروز بن کر نمودار ہو گیا ہے۔

یہ روشن مستقبل کب طلوع ہو گا؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ اس کا علم اس کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے، جس کے پاس غیب کی ساری کنجیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے نصرت و فتح کا قطعی وعدہ ضرور فرمایا: **إِنَّهُمْ لَكُمُ الْمَنْصُورُونَ - وَإِن جندنا لَهُمُ الْغَالِبُونَ** یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب رہے

گا۔ (الصافات ۷۳: ۷۲-۷۳) لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمایا: ”اے نبی“ صبر کرو، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی ان کو ان بڑے نتائج کا کوئی حصہ دکھادیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں، یا (اس سے پہلے) تمہیں دنیا سے اٹھالیں۔“ (المومن ۳۰: ۷۷) ہمارے ساتھ بھی اَنْتُمْ الْاٰمِلُوْنَ اور كَيْسَتَغْلِبَنَّهُمْ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہیں گے، خواہ ہماری آنکھیں کامرانی کا یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔

جو بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ روشن مستقبل کے حصول کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے جدوجہد کا راستہ، انفاق اور جمانی تکمیل اللہ کا راستہ۔ نصرت الہی کے بغیر تو ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا، کجا کہ منزل سر ہو جائے۔ اِنْ يَنْصُرْكُمْ اللّٰهُ فَلَا مَالَ لَكُمْ، اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غلبہ آنے والی نہیں، (آل عمران ۱۶۰: ۳) لیکن یہ نصرت الہی صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جو جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ (محمد ۷: ۷۷) جس سچے ایمان کے ساتھ سر بلندی کا وعدہ مشروط ہے، اس کی صداقت کی کوئی بھی جدوجہد ہی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَمَعُوا بَيْنَهُمْ وَالنَّفْسِ بِمَا وَابَاؤُهُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ، حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جملوا کیے۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ (الحجرات ۱۵: ۳۹)

جدوجہد کے کئی پہلو ہیں: خود اپنے اندر جدوجہد کی استعداد پیدا کرنا، اور اپنی شخصیت کو جدوجہد کے لائق بنانا۔ انسانوں کی مطلوب ضروری تعداد کو جدوجہد کے لیے کھڑا کرنا، ان کو ایک قوت بنانا، ان کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اور بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر تر طریقے اور تدابیر سے جدوجہد میں لگانا۔ ماحول، معاشرہ، انسان اور نظام، جیسے کچھ ہیں، ان ہی کے درمیان اپنے لیے پیش رفت اور منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ بنانا۔ اس مقصد کے لیے راہ کے امکانات و خطرات کا، موافق و مخالف عوامل اور قوتوں کا، حال اور مستقبل کا زیادہ سے زیادہ ممکن صحیح اندازہ کرنا۔ ایسی حکمت عملی اختیار کرنا جس سے منزل مقصود تک پہنچنا ممکن نظر آئے۔ اپنے اعمال و اقدامات کا جائزہ و احتساب اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر استغفار کی روش پر کاربند رہنا۔ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ اِلَّا اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اٰمِنْ لَّنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اٰمِرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلٰى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ، ان کی دعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو، اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“ (آل عمران ۷۳: ۱۳) یہاں تک کہ فتح و نصرت دیکھ کر بھی یہی روش رہے: فَدَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ، اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، (النصر ۴۰: ۳)

صرف تمنا اور خواہش سے مستقبل کی نقشہ گری نہیں ہو سکتی۔ دعائیں بھی جدوجہد کا بدل نہیں بن سکتیں۔ جدوجہد کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اللہ کی نصرت اور فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بڑی سے بڑی جدوجہد سے بھی اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسانی تدبیر بھی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسانی عقل بھی ان تمام عوامل و حالات کا احاطہ نہیں کر سکتی جو جدوجہد کی کامیابی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ کسی انسان کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ اس سے خامی، کوتاہی، غلطی یا گناہ کا صدور نہ ہو گا۔ کوئی ایسا نسخہ تربیت موجود نہیں جو ایسے کامل انسان پیدا کر سکے جن کے بارے میں ایسی ضمانت دی جاسکے۔ چنانچہ جتنی خام، ضعیف اور کم معیار عقل، استعداد، ایمان اور عمل صالح میسر آئے، اور جتنی بھی بری بھلی جدوجہد بن پڑے، وہ راہ خدا میں پیش کر دینا چاہیے۔ ہر صورت میں حکم اور تدبیر کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اور نتائج صرف مشیت الہی پر منحصر ہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کی نگاہ اور عقل کام کرے، وہاں تک یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جدوجہد کی کامیابی کے لیے ضروری شرائط زیادہ سے زیادہ پوری ہوں۔ آج اس موضوع کو سمیٹ کر ہم چند اہم اور بنیادی باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان قوتوں اور تحریکات کی توجہ کے لیے جنہوں نے اس صدی میں غلبہ دین کی لہر پیدا کی ہے۔

۱۔ سب سے ضروری اور اہم شرط للہیت اور اخلاص ہے۔ پوری جدوجہد، اور جدوجہد کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے، اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے۔ رضائے الہی کی جستجو، جنت کی تمنا و طلب اور اس کے لیے بھاگ دوڑ اور مسابقت اسی للہیت ہی کی تعبیر ہے۔ قرآن میں جہاں بندگی کی دعوت ہے، وہاں مُخْلِصِينَ کی شرط لگنی ہوئی ہے، اکثر مقامات پر وَجْهِ رَبِّعَالِی اور مَرْضَاتِ اللّٰہِ کی جستجو کی تائید ہے، اور جہاں جدوجہد کا ذکر ہے، وہاں جنت کو مطلوب و محبوب بنانے کی دعوت ہے۔ قرآن اس دعوت سے بھرا ہوا ہے۔

آج غلبہ دین کی جدوجہد کو جو بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں، ان کی بڑی وجہ ہمارے نزدیک اسی مطلوب اخلاص اور للہیت میں کمی یا کمزوری ہے۔ یہ افراد کی سستی اور بے رغبتی ہو، تحریکوں میں جمود ہو، دنیا طلبی کا غلبہ ہو، حمدوں اور جاہ و عزت کی طمع ہو، خود رائی و خود سری ہو، نظم و ضبط کی کمی ہو، باہمی افتراق و تنازعات ہوں، دعوت الی اللہ سے لاپرواہی اور دعوت کی بے اثری ہو۔۔۔۔۔ جو بھی ہو، کھنگال کر دیکھیے تو تمہ میں یہی مرض ملے گا۔ سب سے بڑا سلگتا مسئلہ یہی اخلاص و للہیت میں کمی کا مسئلہ ہے۔

للہیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ہر فرد کا اپنا معاملہ ہے۔ وہی اپنے اندر للہیت پیدا کر سکتا ہے، وہی جدوجہد کو للہیت کے رنگ میں رنگ سکتا ہے، وہی اس کے ہونے یا نہ ہونے کے لیے ذمے دار اور جواب

وہ ہے، اور اگر یہ نہ ہو تو نقصان بھی سراسر اسی کا ہے۔ یہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان معاملہ ہے اور وہ جو حلیم بذات الصدور ہے۔ وہی صحیح علم رکھتا ہے اور فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس میں کتنی لئبیت ہے۔ اجتماعی جدوجہد میں تو ہر طرح کے لوگ شامل ہونا چاہئیں، اور ہوں گے: وہ بھی جن کے دل اخلاص کی اس نعمت سے خالی ہوں، وہ بھی جن کے دل اس سے ملامل ہوں۔ کوئی اجتماعیت ہر فرد کے اندر لئبیت پیدا کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی، نہ اسے فرد کے اخلاص کو جدوجہد میں شرکت کے لیے شرط بنانا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف اجتماعیت کو تین باتوں کا اہتمام پوری شدت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ تذکیر و موعظت اور دعوت کے تمام ممکن اور رائج طریقوں سے لوگوں کو مسلسل اور تاکید کے ساتھ لئبیت کی طرف ترغیب کرتی رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اجتماعی ماحول اور کلچر کو لئبیت کے رنگ میں رنگنے کا اہتمام کرے۔ جو اس ماحول میں سانس لے، اس پر یہ رنگ چڑھے۔ وہ رضائے الہی اور جنت کی قدر و قیمت اور مطلوبیت کا خریدار بن جائے۔ تیسرے یہ کہ اجتماعیت اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے بارے میں فیصلے کرتے ہوئے لازماً دنیا میں ان کے نتائج کو سامنے رکھے، لیکن مجموعی طور پر نیت اور محرک صرف اللہ اور جنت کو رکھے، اور کوشش کرے کہ کوئی ایسا قدم تو ہرگز نہ اٹھائے جو اللہ کو ناپسند ہو، مثلاً: تدابیر وہ ضرور اختیار کی جائیں جن کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک سفر ہوں، لیکن نیت ان کی اور اپنی اخروی فلاح ہی رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جس قدر اخلاص بڑھے گا، لئبیت رچے گی اور بے گی، اس کا رنگ زندگی پر چھائے گا، اس قدر ہمارے مسائل حل ہوں گے، ہماری کمزوریاں اور خرابیاں دور ہوں گی، ہمارے اندر مضبوطی اور شوق و طلب میں اضافہ ہو گا، اور ہم نصرت الہی کے مستحق بنیں گے۔

۲۔ دوسری اہم اور ضروری شرط ہے، زیادہ سے زیادہ انسانوں کو۔۔۔ ہر طرح، ہر معیار اور ہر انداز کے انسانوں کو۔۔۔ دینی جدوجہد کے دائرے میں جمع کرنا، اور ان کی جو بھی استعداد و صلاحیت ہو اسے دین کے کام میں لگا دینا۔ لئبیت اگر روح و مقصود و بنیاد ہے، تو انسان دینی جدوجہد کا مرکز و محور ہے۔ ہمارے نزدیک دینی جدوجہد کا دوسرا بڑا سلگتا مسئلہ یہی ہے کہ اس جدوجہد میں انسان کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان تک، ہر طرح کے انسان تک پہنچنے، اس کے دل میں گھر کرنے، اسے اپنا ہم نوا بنانے، اسے اپنے دائرے میں جمع کرنے، اسے اپنے ساتھ لے کر چلنے، اور اس کی استعداد و صلاحیت کو نسیاع سے بچا کر دین کے لیے کارگر بنانے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ بے شمار ممالک ہیں جہاں منظم دینی گروہ موجود ہیں، ان کے پاس قوت و طاقت بھی ہے، صلاحیت، نیکی اور تقویٰ بھی موجود ہے، لیکن عام معاشرہ ان کے ساتھ نہیں۔ کوئی موثر عوامی مزاحمت کی لہر نہیں اٹھتی،

حالانکہ حکومتیں ہزاروں کو فسخ کر دیتی ہیں، مثلاً شام میں، ہزاروں کو جیلوں میں بند کر کے تعذیب کا شکار بناتی ہیں، مصر میں، انتخابی عمل کو من مانے طریقے سے اپنی مرضی کے نتائج نکالنے کے لیے استعمال کرتی ہیں، انڈونیشیا اور مصر میں، آزادانہ انتخابات ہوتے ہیں مگر بھاری اکثریت غلبہ دین کے حامیوں کے حق میں ووٹ دینے کو تیار نہیں، پاکستان اور ترکی میں، جہاں ظلم و جبر کے خلاف ہتھیار اٹھائے گئے ہیں اور تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا ہے وہاں بھی عام آبادی نے ساتھ نہیں دیا ہے، الجزائر میں جتنی زبردست اور جتنی طویل مسلمہ جدوجہد برپا رہی، اس پیمانے پر کوئی عوامی مزاحمت کی تحریک ہوتی جس میں معاشرے کا بڑا حصہ شامل ہوتا، تو کیا کوئی حکومت ٹک سکتی تھی۔ اس دائرے میں مطلوب کامیابی کیسے حاصل ہو؟ عام معاشرے کو کیسے اپنا ہم نوا اور ہم رکاب بنایا جائے؟ یہی آج کا دوسرا بڑا چیلنج ہے۔

اس سلسلے میں مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کئی پہلوؤں سے غور و فکر اور اقدامات کی ضرورت ہے۔ دینی جدوجہد میں انسان کی قدر و قیمت، اس کی ضرورت اور اس کا مقام جاننے اور تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ دین کا، اس کے پیغام اور جدوجہد کا مخاطب ہر عام انسان ہے، امت مسلمہ عام انسانوں کے لیے (انجمن لٹنس) برپا کی گئی ہے۔ دینی جدوجہد کا مقصد ہر انسان کی اخروی اور دنیوی فلاح ہے۔ دین کی دعوت اور جدوجہد انسانوں کے ذریعے ہی انجام پا سکتی ہے، دینی نظام انسانی ہاتھوں ہی سے چلے گا، انسانوں ہی پر قائم ہو گا، انہی کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہو گا۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو ہر وہ انسان قیمتی ہے جو دینی مقاصد کا کوئی حصہ بھی قبول کرے، جو دینی جدوجہد میں کسی درجے میں بھی شرکت کرنے کو تیار ہو۔ ہر انسان کو اپنا بنا لینا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا، یہ ہر دینی جدوجہد کرنے والے کا فرض ہے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں، جو دینی مقاصد کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر گونا گوں معاشرتی و سیاسی وجوہات کی بنا پر ان کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے، حاصل کرنا چاہیے، اور وہ ضروری و مفید ہو سکتی ہے۔ جیسے ابوطالب یا وہ سرداران قریش جو قربت یا شرافت نفس کی وجہ سے مظلوم و مغمور مسلمانوں کو حفاظت و پناہ فراہم کرتے تھے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں جو سخت دشمن ہوں، لیکن جن کے ساتھ آجانے سے معاشرے میں وزن کا پلڑا جھک سکتا ہو۔ جیسے ابو جہل اور عمر بن الخطاب، جن کے لیے خود حضور نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اسلام کی تقویت کا سامان کرے۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انسان اپنی صلاحیت و استعداد کے لحاظ سے، اپنے ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے اور اپنے کردار کے لحاظ سے اعلیٰ بھی ہوں گے اور ادنیٰ بھی۔ لیکن اندھا بھی ہو تو وہ توجہ اور مقام کا مستحق ہے۔ میدان جنگ سے پلٹ آنے والے ہوں، تو وہ بھی عفو و استغفار اور اجتماعی معاملات میں شریک رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ عبد اللہ بن ابی جیسے دشمن منافق کے ساتھ بھی اس حد تک نرم برتاؤ کیا گیا کہ ”لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔“

ایک بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں یقیناً وابستگی و وفاداری اور ایمان و عمل کے لحاظ سے معیاری لوگوں کی تلاش بھی ہوگی، ایسے لوگ جمع کرنے اور بنانے کی خصوصی فکر بھی ہوگی، اور ابتدائی مراحل میں تو زیادہ اہتمام سے ہوگی، لیکن جیسے ہی انسانوں کی قوت استعمال کر کے غلبہ دین کی جدوجہد شروع ہوگی۔۔۔ سیاہی ہو، معاشرتی، یا عسکری۔۔۔ دیسے ہی ہر مسلمان کو، وہ کیسا ہی مسلمان ہو، اپنے ساتھ شامل کرنا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا ضروری ہو گا۔ بنی اسرائیل کے جن ”مسلمانوں“ کو اپنے ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے تھے، ذرا قرآن اور تورات میں ان کی ایمانی، اعتقادی، اخلاقی، عملی اور دینی حالت دیکھیے، تو آپ کو ہماری اس بات کی اہمیت کا صحیح ادراک ہو گا۔

ایک دفعہ انسان کا یہ مقام سمجھ لیا جائے تو رویوں، پالیسیوں اور نظام میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت خود بہ خود محسوس ہوگی، تبدیلیاں خود بہ خود پیدا ہوں گی۔ پھر ہر شخص جس کا ساتھ دینا ضروری ہو، یا جو ساتھ دینے کے لیے تیار ہو، اس کے لیے دل کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور دائرہ اجتماعیت کے دروازے بھی۔ اجتماعی نظام جو تحریکوں نے اختیار کیے ہوئے ہیں نصوص پر مبنی نہیں، اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان کو وضع کرنے میں ہمارے سامنے عصر حاضر کی نظریاتی تحریکوں کے نظام کے ماڈل بھی رہے ہیں۔ لیکن ہماری روایات میں اور بھی ماڈل موجود ہیں، اور آج کے دور میں اور بھی ماڈل رائج ہیں، اور نصوص کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کے ذریعے ہم کو ایسے ماڈل وضع کرنا چاہیے جو ان تمام انسانوں کو مساوی شرکت کا بھرپور احساس دے سکیں جو اس غلبہ دین کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر لینے، اور صرف معیاری لوگوں کو لینے سے ہی وہ قلیل گروہ تیار ہوئے جو قلیل ہونے کے باوجود قوی اور موثر ہیں۔ لیکن اس طریقے سے تحدید و تفریق بھی پیدا ہوئی۔ جس سے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس قلیل گروہ کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس پورے مسئلے کا ازسرنو جائزہ لے کر ہم مناسب دور رس اقدامات کریں جو عام انسانوں کو اپنے دائرے میں جمع کرنے میں مدد و معاون ہوں۔

اس سلسلے میں یہ غلط فہمی بھی دل سے نکال دینا چاہیے کہ تعداد فی نفسہ مطلوب نہیں، تعداد کی طلب اور جستجو مستحسن نہیں، تعداد و توسیع اور معیار و استحکام میں کوئی بنیادی و منطقی تضاد ہے۔ اصل چیز تو معیار ہے، تعداد سے کیا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ بات تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصرت و فتح کی علامت، ”یدخلون فی دین اللہ افواجاً“ کو قرار دیا ہے، اپنی امت کی تعداد کو حضورؐ نے اپنے لیے باعث فخر قرار دیا ہے، اور اس تعداد میں انسانے کے لیے حضورؐ رات دن کوشاں رہے ہیں۔ اور اگر دینی جدوجہد میں شریک ہونا ہی نار جنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا سب سے یقینی راستہ ہے، تو اس راستے کو کسی کے لیے بند کیوں کر کیا جاسکتا ہے، یا کسی کو انتظار و تعویق میں کیوں کر ڈالا جاسکتا ہے۔

یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایسی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ محض انسان کو مرکز بنانے،

اس کا مقام تسلیم کرنے، ہر طرح کے انسان کے لیے دل اور اجتماعیت کے دروازے کھول دینے سے، ایک عام معاشرہ بڑی تعداد میں کسی نہ کسی طرح دینی جدوجہد میں شامل ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ایسے انداز و اسلوب میں وہ دعوت بھی ضروری ہے جو دلوں کو مسخر کر سکے، اور وہ قیادت بھی جو دلوں کو جیت لے۔ اس کے بعد بھی ماحول، حالات اور مشیت الہی پر کامیابی کا انحصار ہو گا۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر ایک دفعہ ہم نے اس بات کو سمجھ لیا کہ معاشرہ اور انسان کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں، اسی معاشرے اور انہی انسانوں میں سے وہ قوت پیدا کرنا ہے، اور وہ پیدا ہو سکتی ہے، جو اصلاح و تبدیلی اور غلبہ و سرپرستی کا کام کر سکے۔ اللہ کی نصرت کے بعد، کامیابی کا راز انسانی قوت میں پوشیدہ ہے، نہ کہ مال و اسباب اور اسلحہ و سلاخ میں۔ **هُوَ الَّذِي آتَىٰكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ** وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمہاری تائید کی۔ (الانفال ۶۳:۸) اور **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَمِّبِكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ** اے نبی! تمہارے لیے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ ہی کافی ہے۔ (الانفال ۶۳:۸)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مومنین کی اس جماعت میں لوگوں کے مقام اور درجات کا تعین اللہ کے لیے ان کی وفاداری و قربانی سے ہوا کرتا تھا۔ ایمان، عمل صالح اور تقویٰ تو وہ چیزیں ہیں جن کا صحیح علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ چنانچہ ماجرین، انصار، اصحاب بدر، اصحاب بیت الرضوان وغیرہ وہ معیار تھے جن پر لوگوں کو مقام دیا جاتا تھا۔ رہے حکومتی اور فوجی مناصب، تو ایسے لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی جو، ایمان اور وفاداری کے ساتھ ساتھ، ان مناصب کو کامیابی کے ساتھ سنبھالنے کی زیادہ صلاحیت اور اہلیت رکھتے تھے۔ اس کے بے شمار نکلے موجود ہیں۔

ان دو بڑے مسائل کے بعد ہم بقیہ اہم مسائل پر مختصر گفتگو کریں گے:

۳۔ ایک بڑا مسئلہ حسن اخلاق کا ہے۔ لوگوں کے دل جیتنے، ان کو ساتھ لانے، جوڑے رکھنے، اور ساتھ چلانے کے لیے سب سے موثر قوت حسن اخلاق کی قوت ہے۔ یہ حسن اخلاق، رافت و رحمت، نرمی و فیاضی، غنودرگزر اور اکرام و احسان سے عبارت ہے۔ اصل کارگر اور موثر قوت نہ نظریے میں ہے، نہ کتاب میں، نہ کلام میں، نہ تحریر و تقریر میں، نہ ڈپلومیسی اور پبلک ریلیشن میں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج کے دینی جدوجہد کرنے والوں کے اخلاق کو نبی کریمؐ کے خلق عظیم سے وہ کم سے کم نسبت حاصل نہیں ہوئی ہے جو مطلوب اور ضروری ہے، اور قاتل حصول ہے۔ یہ حضورؐ کا اخلاق کریمانہ تھا، جس کی مدح قرآن میں ہے اور جس کی تصویر سیرت میں دیکھی جاسکتی ہے، جس نے متناطیس کی طرح لوگوں کو چمٹا لیا، اور چمٹائے رکھا۔ **وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظًا لَّغَلَبْتَ أَعْيُنَ النَّاسِ لَأَنْفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ** تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ

اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ (آل عمران ۱۵۹:۳) اور حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ ذَؤُفَ رَحِيْمٌ، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ (التوبہ ۱۲۸:۹)

اس کمی کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے: افغانستان میں اتنے طویل عرصے تک جملہ جاری رہا، کامیابیاں اور فتوحات حاصل ہوئیں، لیکن مجاہدین نہ باہم الفت و اعتماد کے رشتے میں جڑ سکے، نہ یہ دیکھنے میں آیا کہ مخالفین میں سے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر آئے ہوں اور مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے ہوں۔ جن کیونٹ جرنیلوں نے کسی گروہ کا ساتھ دیا، تو وہ صرف اپنے مفادات کی خاطر۔ پاکستان میں آپ گھوم پھر کر دیکھ لیجیے، شہزہی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوگی جو مخالف کیمپ سے ٹوٹ کر آئے ہوں اور اب دین کے غلبے کو مقصد زندگی بنا لیا ہو۔ طالبان کا گروہ خالص قیام شریعت کا دعوے وار ہے۔ ایک طرف طائف کا سفر دیکھیے اور تھیت کے وفد کا خیر مقدم، سرداران قریش کے مظالم دیکھیے اور لَا تَتَّوَبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ کی صدا، اور دوسری طرف اس نجیب اللہ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر اپنے جوش انتقام اور حمیت دین کی تسکین کا سامن کرنا دیکھیے، جو اقوام متحدہ کی پناہ میں تھا، نہتا اور غیر مسلم تھا! حالانکہ مشرک بھی امن طلب کرے تو اسے امن تک پہنچانے کا حکم ہے۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم سے کم سے کم نسبت کے حصول کے بغیر انسان جمع نہ ہوں گے، مخالفین کے دل مسخر نہ ہوں گے، اسلام کے غلبے کے لیے قوت فراہم نہ ہوگی، اور نتیجتاً دین کا قیام ایک امر محال ہوگا۔ خواہ ہمارے پاس اسلحہ کے ڈھیر ہوں، سیاسی اقتدار بھی ہو، دلائل و براہین کا انبار بھی ہو۔

۳۔ چوتھا مسئلہ اختلافات کا افتراق و نزاع بن کر وحدت اور شیرازہ بندی کو غیر معمولی نقصان پہنچانے کا مسئلہ ہے، اور اختلافات کے باوجود متحد رہنے، ساتھ مل کر کام کرنے اور دینی قوتوں کو متحد رکھنے کا مسئلہ ہے۔ جہاں انسان جمع ہوں گے، وہاں اختلافات لازماً ہوں گے۔ رائے کے اختلافات بھی ہوں گے، مزاج کے بھی، مفادات کے بھی۔ ان اختلافات سے کوئی مفر نہیں۔ دور صحابہؓ میں بھی نہیں تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ سے لے کر جنگ جمل و صفین تک کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

اختلافات سے بچنا ممکن نہیں، لیکن اختلافات کو افتراق، تنازع اور محاصرت بننے سے روکنا ممکن ہے۔ لا تفرقوا اور لا تنازعوا ہی کی تاکید قرآن مجید نے فرمائی ہے۔ لیکن اس پہلو سے بھی مسلمان بہ حیثیت مجموعی، اور دینی جدوجہد کرنے والے، خاص طور پر، جن کمزوریوں کا شکار ہیں وہ عیاں ہیں۔

اختلافات کے باوجود بڑے اور عزیز تر مقاصد کی خاطر متحد رہنے کے لیے سب سے بڑھ کر اخلاص و اہمیت اور نفس پر قبضہ و قابو درکار ہے۔ اس کی یقیناً کمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مناسب تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کو اجتماعی زندگی میں اختلافات کا مقام معلوم ہو، اختلاف کی حدود و آداب

سے واقفیت ہو، ان آداب و حدود کی پابندی کی استعداد پیدا ہو۔ جھٹ حلال و حرام اور حق و باطل اور کفر و اسلام کے فتوے جاری کرنے کے طریقے کو ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ تدبیری امور ہوں یا اجتہادی مسائل، اپنی رائے کو حتمی اور آخری سمجھنے کی خود سری پر قابو پانا ضروری ہے۔ اصحاب المرءہ برایہ (اپنی رائے کو سب سے بہتر سمجھنا) ہلاکت کا سلن ہے۔ ہر اختلاف کو حق و باطل کا مسئلہ بنا لینے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اپنی رائے کو صحیح سمجھنے کے باوجود اس کے غلط ہونے کے احتمال، اور دوسری رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود اس کے صحیح ہونے کے احتمال کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

اختلافات کے حدود و آداب کی پابندی اور اختلاف کے دائرے تک محدود رکھنے کے بغیر، نہ کسی اجتماعی قوت کے مضبوط بننے کا امکان ہے، نہ اس کا امکان کہ وہ معاشرے کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ جمع کر لے۔

۵۔ پانچواں مسئلہ، اجتہادی امور اور تدابیر کو نصوص کا درجہ دینے، بنیادی اور اصل مقاصد کے بجائے جزئیات و فروعات پر توجہ اور مسامحہ کو مرکوز کرنے، اور پھر دینی احکام میں غلو اور تشدد اور بیل کی کھل نکلنے پر اصرار کا مسئلہ ہے۔ امت میں تو یہ مرض عام ہے، اور اس کے زوال اور انتشار کا ایک بڑا سبب ہے۔ دینی قوتوں میں بھی اس مرض کا غالبہ صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سید مودودی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں، مثلاً ”تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں“ میں بڑے سوز و درد مندی سے، شدت اور اہتمام سے، مضبوط دلائل کے ساتھ، اس مرض کے خلاف جلو کیا، لیکن اس سے چھٹکارا نہیں ہو سکا ہے۔

اس مرض کی وجہ سے صرف غلو اور تعمق کی بیماریاں ہی نہیں پیدا ہوتیں، جو شاہ ولی اللہ صاحب کے بقول دین میں انحراف کا باعث ہیں، افتراق و انتشار میں اضافہ ہی نہیں ہوتا، توجہ اور وسائل انسانی کا ضیاع ہی نہیں ہوتا، بلکہ اصل کام اور اصل مقصد بھی ٹکھوں سے او جھل ہو جاتا ہے، اور جدوجہد کے لیے کھڑے ہونے والے لوگ ان گلی کوچوں میں اس طرح بھٹک جاتے ہیں کہ بساط زندگی میں ان کے سب مرے مات کھا جاتے ہیں۔

علامہ اقبال، ”ابلیس کی زبان سے مسلمان کی بربادی کے لیے یہی نسخہ تجویز کراتے ہیں، تاکہ:

توڑ ڈالیں جس کی بکیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
کیا مسلمان کے لیے کفنی نہیں اس دور میں،
یہ ایستادہ کے ترشے ہوئے لات و منت

ہے وہی شعر و تصوف۔ اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات

امام بخاری کی روایت کے مطابق جب ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں لوگ اسی مقام پر نوافل پڑھنے لگے
جس مقام پر فرائض پڑھتے تھے، تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے متنبہ فرمایا کہ پچھلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہو
گئیں۔ انہوں نے احکام و مطالبات کے درجات میں خلط ملط ہو جانے کے اسی مرض کی نشان دہی کی تھی،
اور حضورؐ نے ان کی بات کی تصدیق فرمائی تھی۔

دینی احکام و مطالبات کے ضمن ہی میں نہیں، دیگر اجتماعی امور میں بھی یہ مرض دیکھا جاسکتا ہے۔ چیز کو
ذرائع کا مقام — مثلاً تنظیم، اجتماعات، اپنے طے کردہ وظائف و فرائض اور پروگرام — وہ خود مقصد بن
گئی ہیں۔ تدابیر کا دائرہ تنگ اور محدود ہو گیا ہے، اور ان میں تبدیلی و تغیر انتشار کا باعث بن گیا ہے، اس لیے
کہ اپنے اختیارات کو نصوص کا، اور تدابیر کو اصول دین کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس سلگتے مسئلے کو حل کیے
بغیر نہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہو گا، نہ ذرائع مطلوبہ نتائج دیں گے، نہ متحد و متفق رہ کر حالات کے تغیر کے
ساتھ مناسب احوال، حکمت عملی اور تدابیر کا اختیار کرنا ممکن ہو گا۔

۶۔ ایک اور سلگتا مسئلہ اتحاد اور یک جہتی کا ہے۔ امت اور معاشرے میں بھی، دینی قوتوں میں بھی، اور
مشترک مقاصد کے لیے سیاسی قوتوں میں بھی۔ مسلم معاشرے ہر جگہ مختلف نوعیت کے تفرقوں اور انتشار کا
شکار ہیں۔ دینی فرقہ وارانہ اختلافات بھی ہیں، سیاسی اختلافات بھی ہیں، جنہوں نے امت کو باہم نبرد آزما
گروہوں میں پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ تصادم اور خون ریزی بھی ہے، ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار
بھی نہیں۔ سب سے زیادہ الم ناک بات یہ ہے کہ وہ تحریکات جو غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے ہی برپا ہوئی
ہیں، وہ بھی یک جان و متحد ہو کر کام کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا ہم نے افغانستان میں دیکھا، جیسا ہم برطانیہ،
یورپ اور امریکہ میں دیکھ رہے ہیں۔ جو معاشرے تفرقے اور انتشار کا شکار ہوں، ان کی بڑی تعداد کو کسی
دینی مقصد اور دینی قوت کی پشت پناہی کے لیے کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے پہلا ضروری کام تو یہ ہے کہ
جہاں تحریکی قوتوں کے متحد و مشترک ہو کر کام کرنے سے نتائج میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے، وہاں عدم اتحاد
کے اسباب کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اور مشترک جدوجہد کے لیے نظام اور لائحہ عمل وضع کرنا بھی ضروری
ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ اختلافات ہیں، ان کو کم کرنے کے لیے تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے، اور سیاسی

تدابیر بھی۔ جہاں سیاسی مقاصد کا حصول پیش نظر ہے، تو سیاسی کشمکش کا، جنگ کی طرح، بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حلیف بنائے جائیں، کم سے کم لوگوں کو مخالف اور حریف بننے کا موقع دیا جائے، کم سے کم محاذ کھولے جائیں، ایک دشمن کو شکست دینے کے بعد دوسرے دشمن کا رخ کیا جائے، ساتھ مل کر اقدامات کرنے کے دروازے کبھی بند نہ کیے جائیں، عداوت کی آگ کسی طرح نہ بھڑکنے دی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمت عملی اسی اتحاد اور تعریف کی جستجو اور قیام کی بہترین مثال ہے۔ معاہدہ مدینہ کے ذریعے یہود کو ساتھ ملانا، کافر قبائل سے معاہدے کر کے ان کو حلیف بنانا، یا کم از کم ان کی عداوت کے امکانات و مواقع کو ختم کرنا، دوستوں کو دوست رکھنا، دشمنوں کو دوست بنانے کی ہر ممکن تدبیر کرنا۔

۷۷ ساتواں مسئلہ، سیاست ایسی موثر کرنا ہے جو مطلوب نتائج کا پھل دے سکے۔ سیاست بھی ایک ذریعہ ہے، معاشرے میں قوت و طاقت کے سرچشموں میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے، یا انھیں اپنے ہاتھ میں لینے کا۔ بلوچوں اس کے کہ سیاست کو دینی جدوجہد میں مرکزی مقام دیا گیا ہے، اور ہمارے نزدیک صحیح دیا گیا ہے، اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ بیش تر جگہ سیاست کے نتیجے میں وہ قوت نہیں حاصل ہوئی جو مطلوب تھی۔ اس اہم مسئلے کے بھی کئی پہلو ہیں۔

ایک: اب تک دین و سیاست کی تفریق سے سوچ اور فکر پاک نہیں ہو سکی۔ چنانچہ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ سیاست زیادہ ہو رہی ہے، یا زیادہ سیاسی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جو کام بھی اللہ کے لیے، اللہ کے حکم کے دائرے میں ہو، وہ خالص دینی کام ہے، خواہ قتال و ملک گیری جیسا سیاسی و دنیوی کام ہو۔ اور جو کام للہیت سے خالی ہو یا احکام الہی کی خلاف ورزی پر مبنی ہو، وہ دنیوی اور سیاسی کام ہے، خواہ شہادت اور تعلیم قرآن جیسا بظاہر دینی کام ہو۔

دوسرے: سیاست کا مقصد دینی مقاصد کا حصول ہونا چاہیے، اور جو سیاست ان مقاصد کے لیے ہو وہ دینی سیاست ہے، عبادت ہے۔ لیکن سیاسی تدابیر کو، جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی نہ ہوں، احکام دینی کا مقام دینے کی روش صحیح نہیں، مگر یہ روش بھی بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اس طرح دینی قوتوں کا دائرہ عمل بھی محدود ہو جاتا ہے اور دائرہ حمایت بھی۔ تدابیر میں حالات کی مناسبت سے تغیر و تبدل کے بغیر کبھی بھی کامیاب سیاست نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تغیر و تبدل ناممکن ہو جاتا ہے۔

تیسرے: کامیاب سیاست کے لیے واضح اہداف بھی ضروری ہیں، واقعات اور حالات پر بھی گرفت بھی، مستقبل کے بارے میں صحیح اندازے اور پیش بینی بھی۔ پھر اگر مستقبل کے اندازے صحیح نہ نکلیں تو ان میں ترمیم کر لینا، اور تبدیل شدہ حقائق کے مطابق تدابیر کو ڈھل لینا، یہ بھی ضروری ہے۔ اگر اپنی تدابیر کے نتیجے میں ہم اپنے کو بند گلی میں پائیں، تو اپنے حالات و معاملات کے فہم اور انداز سیاست پر نظر ثانی کی ضرورت

ہے۔

چوتھے : معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش یقیناً ضروری ہے، لیکن جیسا بھی معاشرہ عمل اور حقیقت کی دنیا میں موجود ہو، اسی معاشرے میں اپنے لیے پیش رفت کا راستہ نکالنا بھی ضروری ہے۔ معاشرہ بھی ان ہی لوگوں کے قابو میں آئے گا، وہی اس پر حکومت کر سکیں گے، جو ایک نظریاتی و مثالی معاشرے کے قیام کے لیے بے سود تلاش و انتظار چھوڑ کر ایک واقعی و حقیقی انسانی معاشرے میں سے اپنے لیے قوت بھی فراہم کر سکیں، اور اس معاشرے کو چلا بھی سکیں۔ جو اپنے سے مختلف لوگوں کو اپنے ساتھ چلانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، وہ نہ کامیاب سیاست کر سکتے ہیں نہ کامیاب حکومت۔

آخری جہت یہ کہ، سیاست صرف حکومتی اور انتخابی سیاست کا نام نہیں۔ حکومت کا اقتدار بھی محدود ہوتا ہے۔ ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کی وجہ سے بھی، اور معاشرے میں طاقت کے دوسرے سرچشموں کی وجہ سے بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سیاست کے دائرے کو حکومت اور انتخابات سے وسیع کر کے اس میں معاشرے اور ریاست کے تمام قوت و طاقت اور اثر و رسوخ کے حامل اداروں کو شامل کریں۔

۸۔ آٹھواں مسئلہ : مغرب کی فوجی، سیاسی، ثقافتی، علمی اور ابلاغی بالادستی اور تسلط کا ہے۔ عالمی قیادت تقریباً تین سو سال سے اہل مغرب کے پاس ہے۔ زبان ان کی ہے، اصطلاحات ان کی ہیں، اوارے ان کے ہیں، قوانین ان کے ہیں، تجارت ان کی ہے، عالمی تجارت پر ان کا کنٹرول ہے، ذرائع ابلاغ ان کے قبضے میں ہیں، اپنی فوجی قوت کو وہ ناقابل شکست سمجھتے ہیں۔ لبرلزم، منڈی کی معیشت اور مغربی جمہوریت کی فتح اور عالمی غلبے کو وہ اپنی حتمی فتح قرار دیتے ہیں۔

غلبہ دین کے معنی یہ ہیں کہ قیادت عالم، اہل مغرب کے بجائے اہل اسلام کے ہاتھ میں آئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اتنا عظیم الشان تغیر کیسے واقع ہو گا؟ دینی جدوجہد کرنے والوں نے اس مقصد کے لیے کیا حکمت عملی وضع کی ہے؟ ہمارے نزدیک ہمارے پاس نعرے ہیں، جذبہ ہے، محنت ہے، جدوجہد ہے، لیکن کوئی واضح حکمت عملی نہیں ہے، ہم کسی واضح لائحہ عمل پر کاربند نہیں۔

اس ضمن میں ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے: کیا یہ تبدیلی قوت کے بل پر آ سکتی ہے؟ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نہیں۔ کیا یہ تبدیلی اہل مغرب کے دل و دماغ جیت کر آ سکتی ہے؟ اس مقصد کے لیے ہم کچھ نہیں کر رہے۔ کیا یہ تبدیلی آئے بغیر آج، عالمی معیشت، عالمی مغلوات، عالمی عسکری و سیاسی غلبے کے اس دور میں، کیا دنیا کے کسی ایک ملک میں دینی تبدیلی آ سکتی ہے؟ ہمیں اس میں شبہ ہے۔

مشیخت الہی نے نصف صدی میں لاس اینجلس سے لے کر استنبول تک مغرب کی سرزمین میں جو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبلیاں پھیلا دی ہیں، ان آبلیوں میں یہ صلاحیت اور امکان موجود ہے کہ وہ مغرب کے ساتھ

کشمکش میں فرنٹ لائن کا کردار ادا کریں۔ کیا ان آبدیوں کو استعمال کرنے کے لیے ہم کوئی حکمت عملی رکھتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔

پھر مغرب نے ہمیں ایک اور اہم مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ کیا مغرب نے تہذیب و تمدن اور ٹیکنالوجی میں جو ایجادات و اختراعات کی ہیں، جو افکار و خیالات پروان چڑھائے ہیں، جو ادارے اور ذرائع وضع کیے ہیں، وہ سب کفر ہیں، اور مسترد کیے جانے کے قابل؟ یا ان میں ترک و اختیار کی پالیسی اختیار کی جائے گی؟ کیا اسلامی انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو جسے مغرب نے تعمیر کیا ہے، ڈھا دیا جائے گا؟ پھر طبع صاف کیا جائے گا، پھر نئے افکار اور اداروں کی دیواریں اٹھائی جائیں گی؟ کیا حقیقت کی دنیا میں یہ عمل کرنے کا کوئی امکان ہے؟ ہمارے خیال میں نہیں ہے۔

مغرب کے ساتھ تہذیبی کشمکش اور اس میں فتح، بہت بڑا مسئلہ ہے۔ صرف نعروں، ہنگاموں اور جذبات کے اظہار سے یہ مسئلہ حل نہ ہو گا۔ اس کے لیے علم و حکمت، اجتہاد اور جملہ تہذیبوں کی ضرورت ہو گی۔

۹۔ نواں مسئلہ عورت اور نوجوان کا ہے۔ عورت آبادی کا نصف حصہ ہے۔ ایک طرف مسلم معاشروں میں اسے وہ مقام حاصل نہیں جو اسلام نے اسے دیا ہے، یا اسلام کی رو سے اسے دیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مغرب نے معاشرے میں عورت کے مقام اور عورت مرد کے تعلقات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے، انہیں بالکل نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ آنے والے زمانے میں تہذیبی مسائل میں عورت کا مسئلہ سرفہرست ہو گا: اس کا مقام اور اس کے حقوق۔ اس مسئلے پر بھی ہمارے ہاں بڑا فکری اور عملی خلا ہے، جس کو پر کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح مسلمان معاشروں میں آبدیوں کا نصف سے زیادہ حصہ ۳۰ سال سے کم عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ان نوجوانوں کو اپنے ایمان و اقدار اور اپنی تہذیب و ثقافت کا وارث بنائے بغیر نسلہ، این کے مقصد میں کامیابی کا جواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن اسلامی تحریکات اس مقصد کے لیے بھی کوئی واضح فکر اور لائحہ عمل نہیں بنا سکی ہیں۔

۱۰۔ آخری مسئلہ خود اہتسابی، اپنی غلطیوں کے اعتراف، اور اپنی اصلاح کا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اہتساب پر سارے زور کے باوجود، غلبہ دین کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اور تحریکیں، اپنی اجتماعی روش، پالیسیوں اور اقدامات کے سلسلے میں اہتساب و استغفار کے بجائے تلویل و پردہ پوشی کو ترجیح دیتی ہیں۔ نصف صدی کے عرصے میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی اجتماعیت نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا ہو، اور ان کی اصلاح کا اعلان کیا ہو۔ حالانکہ قوموں اور جماعتوں کی ذنوی کامیابیوں میں خود اہتسابی اور استغفار کو قرآن مجید نے کلیدی اور مرکزی مقام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کو خامیوں اور غلطیوں سے مفر نہیں۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کسی انسانی گروہ سے نصف صدی میں کوئی بڑی غلطی نہ سرزد ہوئی ہوگی۔ ہمارے

ہاں دنیا بھر کی خرابیوں اور غلطیوں پر قراردادیں مل جائیں گی، اپنی خرابیوں اور غلطیوں پر کوئی قرارداد نہیں ملے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ پبلک میں اور پبلک کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کو پبلک کے سامنے ہی اپنا احتساب کرنا چاہیے، اپنی غلطیوں کی تلویل یا پردہ پوشی کے بجائے ان کا اعتراف کرنا چاہیے، اپنی اصلاحی تدابیر کا اعلان بھی کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی عزت، دلوں میں مقام، اور ان کے دائرہ اثر و حمایت میں کمی نہیں آئے گی، اضافہ ہو گا۔ صحت مند اور مفید روایات قائم ہوں گی۔ رگوں میں نیا خون دوڑے گا، اصلاح کے دروازے کھلیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ غلبہ دین کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر جائزے، غور و خوض، نظر ثانی، تجدید یا تغیر کا عمل شروع ہو جائے گا تو نصف صدی کی محنت سے جو پھل ہم نے جمع کیے ہیں، وہ گلنے اور ضائع جانے کے بجائے برگ و بار لائیں گے۔ قوموں اور جماعتوں کے لیے انحطاط، زوال اور بگاڑ مقدر نہیں، نہ جمود اور قہطل۔ اجتہاد و جماو سے قوت اور شباب کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ۔